ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

مغلیہ دور کے چند فارسی گو ہندو شعرا

.... اس مختصر سے مضمون میں ان چند مشہور ہندو شعرا کا تعارف مقصود ہے۔ جنھوں نے فارسی شعر و ادب کی خاصی خدمت کی ہے۔ ان میں سے اکثر کے کلام میں تصوف کی چاشنی ملتی ہے؟ ہو سکتا ہے اُنھوں نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر متصوفانہ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہو یا پھر "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کے مصداق اس کا سہارا ڈھونڈا ہو۔ ویسے ان میں سے بعض نے تو واقعی فقیرانہ زندگی بسر کی ہے۔ بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، یہ حضرات اچھے مضامین پیدا کر گئے ہیں تو آیئے ذرا ان کا تعارف اور مطالعہ ہو جائے۔ (واضح ہو کہ اس مضمون میں صرف مغلیہ دور کے ہندو شعرا کا ذکر کیا گیا ہے)۔

توسنی

اس کا نام رائے منوہر اور تخلص توسنی تھا۔ اس کا باپ لون کرن، سانبھر (ایک مشہور نمک زار) کا راجہ تھا۔ اس کا شمار اکبری دور کے ممتاز راجوں میں ہوتا ہے۔ منتخب التواریخ کے مولف ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق پہلے توسنی، محمد منوہر کے نام سے مشہور تھا، پھر اسے میرزا منوہر کے خطاب سے نوازا گیا، اور اس کا باپ اُسے:

"باوجود کفر بشرف و افتخار و مباہات ہمین محمد منوہر میگفت"[۱]

(اہلِ کفر ہوتے ہوئے بھی وہ بڑے فخر اور عزت و شان کے ساتھ اسے اسی نام محمد منوہر سے پکارا کرتا تھا۔)

بچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا کہنا ہے کہ یہ پہلا ہندو شاعر ہے جس کی شہرت ایران تک پہنچی اور صائب جیسے شاعر نے اس کے بعض اشعار اپنی بیاض میں نقل کیے۔ پھر تقی اوحدی نے، کہ

۱۔ منتخب التواریخ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۸۴ھ ص ۳۴۳

ایرانی تھا، اپنے تذکرے میں اسے جگہ دی[۵۲]۔ اسی تذکرہ نویس کے مطابق جب اکبر اپنے تیئسویں سال جلوس (۹۸۶/۱۵۷۸ء) میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے روضہ کی زیارت کے لیے اجمیر گیا ہے اور واپسی پر سانبھر کے نواح میں پہنچ کر اس نے پرانے شہر کی جگہ نئے شہر اور قلعے کی تعمیر کا حکم دیا تو چونکہ یہ علاقہ لون کرن کا تھا، اس لیے اکبر نے اس کے بیٹے کے نام پر اس جگہ کا نام منوہر نگر رکھا[۵۳]۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں اس کا ذکر کیا ہے:

"۔۔۔ پدر من در خرد سالی بر او عنایت بسیار می کردند و فارسی زبان بود، با آنکہ از و تا بہ آدم اطلاقِ فہم، ہیچ یک از قبیلۂ او نمی تواں کرد، خالی از فہمے نیست و شعرِ فارسی میگوید۔"[۵۴]

(یعنی میرے والد (اس کے) بچپن میں اس پر بہت نوازشات کیا کرتے تھے۔ وہ فارسی زبان (فارسی دان) تھا۔ اگرچہ اس سے لے کر حضرتِ آدم تک اس کے قبیلے کے جتنے بھی افراد آئے ہیں ان میں سے کسی ایک پر بھی فہم کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، تاہم وہ فہم سے عاری نہیں اور فارسی میں شعر کہتا ہے۔

(عالمگیر نے اپنے تیئسویں سال جلوس (۱۰۹۱/۱۶۸۰) میں اپنے قیام اجمیر کے دوران اس کی پوتی کو منوہر پور (منوہر نگر) سے طلب کیا۔ اس نے اسلام قبول کیا، لبعد میں شہزادہ محمد کام بخش سے اس کی شادی کر دی گئی)

بدایونی سانبھر کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے: "و این ہمہ نمک در سخن او تاثیرِ آن سرزمین است، صاحبِ حُسن غریب و ذہن عجیب است (یہ جو اس کے کلام میں ملاحت ہے تو یہ اسی سرزمین نمک زار کی تاثیر کا نتیجہ ہے، عجیب حُسن اور انوکھے ذہن کا مالک ہے)۔ بدایونی آخر میں لکھتا ہے کہ تعجب کی بات ہے ایک ہندو اس قدر طبع شعر کا مالک ہو[۵۵] گویا ہر تذکرہ نویس نے اس کی شاعری کو سراہا ہے۔

---

۵۲ تذکرۂ گل رعنا، مطبوعہ حیدر آباد دکن ص ۴۰

۵۳ ایضاً ص ۴۰، ۴۱

۵۴ ایضاً ص ۴۲ بحوالہ توزک جہانگیری (شفیق نے جہانگیر نامہ لکھا ہے)۔

۵۵ منتخب التواریخ ص ۳۴۳، نیز ملاحظہ ہو اردو ترجمہ منتخب التواریخ از محمود احمد فاروقی۔ لاہور ۱۹۶۲ء ص ۶۷۴ "ایک ہندو سے یہ جودتِ طبع اور کمالِ شعر کا ظاہر ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے۔"

ایک ہندو کے لیے فارسی زبان میں شعر کہنا، جو اس کے نزدیک ایک اجنبی زبان ہے، اور پھر اس میں اپنا لوہا منوانا، اس کی خداداد صلاحیتوں کے علاوہ اس زبان سے اس کی انتہائی وابستگی کی دلیل ہے۔ جہانگیر نے اس کا جو شعر نقل کیا ہے وہ تازگیٔ خیال کی ایک عمدہ مثال ہے:

غرض ز خلقتِ سایہ ہمیں بود کہ کسی　　　به نورِ حضرت خورشید پای خود نہ نہد

(سایہ پیدا کرنے کی غایت یہی تھی کہ کوئی شخص سورج کی روشنی پر اپنا پاؤں نہ رکھے)۔

توستی کا جس قدر کلام تذکروں میں ملتا ہے، اس میں ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر تمام کلام کے مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ہندو کا نہیں، کسی صوفی باصفا کا کلام ہے جو عشقِ حقیقی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کی مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں اس نے خدا کے حضور عشقِ جاوداں، نورِ یقین اور بحرِ وحدت سے تعلق کی دعا کی ہے۔ مثنوی کی زبان سادہ و رواں اور تاثیر کی حامل ہے، لہجہ اور زبان سے اہلِ زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔

الٰہی سینہ کن با عشق دمساز　　　دلی دہ معدنِ گنجینۂ راز
بدل داغِ محبت جاوداں نہ　　　نشانِ مہرِ خود بر فرقِ جان نہ
امیدِ من ز تو انعامِ عام است　　　کہ نومیدی ز درگاہت حرام است
ز بحرِ وحدتم گر تر کنی لب　　　چہ کم گردد ترا زین بحر یا رب
بوصفِ خویشتن گویائیم دہ　　　بکویِ خویشتن پویائیم دہ
اگر من کافرم دیں از تو خواہم　　　یقینم دِہ کہ من ایں از تو خواہم
اگر ایماں ہمیں کعبہ پرستی است　　　پرستارانِ بت را طعنہ از چیست
بما کفر است کفر آمیزشِ غیر　　　توئی مقصودِ ما از کعبہ و دیر
منِ سرگشتہ را از مہربانی　　　سویِ خود خواں بہر راہی کہ دانی

ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:۔

● ـــــ الٰہی میرے سینے کو عشق کی دولت سے نواز، ایسا دل عطا کر جو خزینۂ حقیقت کی کان ہو۔

● ـــــ دل میں محبت کا داغ جاوداں رکھ، اپنی محبت کا نشان میری روح کے سر پر رکھ۔

● ـــــ میں تیرے انعامِ عام کا امیدوار ہوں، کیونکہ تیری درگاہ سے ناامید ہونا حرام ہے جو اشارہ ہے:

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی طرف ۔ یزدانی)

- اگر تو بحرِ وحدت سے میری تھوڑی سی پیاس بجھا دے تو اے خدا! تیرے اس بحر سے کچھ بھی کم نہ ہوگا ۔
- ایسی گویائی مجھے عطا کر جو صرف تیری حمد کرے ۔ اپنے کوچے میں مجھے چلنے کی توفیق دے ۔
- اگر میں کافر ہوں تو تجھ سے دین کا طالب ہوں ۔ مجھے یقین کی دولت عطا کر کہ میں تجھ سے اس کا خواہاں ہوں ۔
- اگر ایمان یہی کعبہ پرستی ہے تو پھر بتوں کے پجاریوں کے لیے یہ طعنہ زنی کس لیے ہے ۔
- ہمارا کفر ایسا کفر ہے جس میں غیر (دوئی) کی آمیزش ہے ۔ کعبہ اور دیر سے ہمارا مقصود تو تیری ہی ذات ہے ۔
- مجھ حیران کو اپنی عنایت سے اپنی طرف اس طریقے سے بلا جو تیرے نزدیک بہتر ہو ۔

یہ اشعار تصوف کی چاشنی لیے ہوئے ہیں :

از اثرِ یک نگہِ اوست مست — ہم بت کدہ و ہم بت پرست

(اس کی ایک ہی نگاہ کے مست ہیں ۔ کیا بت کدہ اور کیا بت پرست)

یگانہ گشتن و یک جا شدن زچشم آموز — کہ ہر دو چشم جدا و دو جا نی نگرد

(یگانہ بنتا اور یک جا ہونا آنکھ سے سیکھ کہ دونوں آنکھیں ہیں تو الگ الگ لیکن دیکھتی یک جا ہیں)

شیخ مستغنی بدیں و برہمن مغرور کفر — مستِ حُسنِ دوست را با کفر و ایماں کار نیست

(شیخ دین میں مست اور برہمن کفر کا غرور لیے ہوئے ہیں، لیکن جو دوست کے حسن کا مست ہے وہ کفر و ایمان سے بے نیاز ہے) ۔

عرفی کا بھی یہ شعر ملاحظہ ہو :

عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر — پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

(عارف خواہ اسلام کا ہو یا کفر کا، بگاڑ ہی کا شکار ہے، پروانہ حرم اور دیر کے چراغ کے چکر میں نہیں پڑتا) ۔

در دل ز ہوات ہای و ہوی دگر ست — از سینہ ز شوق گفتگوی دگر ست

ہجران چہ و وصل چیست درمذہب عشق　　زین ہر دو بلند آرزوے دگر ست

(تیری خواہش کے سبب دل میں عجیب طرح کا ہاؤ ہو برپا ہے۔ عشق کی وجہ سے سینے سے متعلق کچھ اور ہی گفتگو ہے۔ ہجر کیا ہے اور وصل کسے کہتے ہیں، مذہب عشق میں ان دونوں سے بڑھ کر کوئی اور ہی آرزو ہے)۔

بی عشق تو در جگر لبالب نار است　　بے درد تو در سرم سراسر خار است

(تیرے عشق کے بغیر جگر آگ سے پُر ہے۔ تیرے درد کے بغیر میرے سر میں کانٹے ہی کانٹے ہیں)

توسنی اپنے ہندو ہونے پہ بھی نازاں ہے۔ کہتا ہے:

آنان کہ ز کیشِ ہندوان عار کنند　　تشنیع بر اہل دیر و خمار کنند

گر دام تعصب از میان بر دارند　　صد خرقہ نثارِ تارِ زنار کنند

(جو لوگ ہندوؤں کے مذہب کو برا سمجھتے ہیں، اہل دیر اور مے فروشوں پر طعن کرتے ہیں، اگر وہ درمیان سے تعصب کا جال اٹھادیں تو وہ زنار کے دھاگے پر سینکڑوں خرقے نثار کر ڈالیں۔)

موزوں

ہندوؤں کی کایستھ قوم نے خاصے ادیب اور شاعر پیدا کیے ہیں۔ موزوں کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے۔ اس کا نام راجہ رام نرائن تھا۔ عظیم آباد کے ایک علاقے نمک (م ک) کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ رنگ لال، بنگالہ کے ناظم مہابت جنگ کا دیوان تھا۔ اس کی دلیری و شجاعت کے باعث اسے عظیم آباد کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور قاسم علی خاں کے ابتدائے عہد تک اسی عہدہ پر مامور رہا۔ ۱۱۷۲/۱۷۵۹ میں جب شاہزادہ عالی گوہر عظیم آباد کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا تو موزوں نے اگرچہ پہلے تو سلطنت کے پاسِ ادب کی خاطر ملازمت اختیار کی، لیکن جب آثار خلاف توقع دیکھے تو قلعہ کی طرف لوٹ گیا، جہاں اس نے دلیری و مردانگی کے جوہر دکھا کر قلعہ کو بچالیا۔

جب جعفر علی شجاع الملک (ناظم بنگالہ) کے بیٹے صادق علی اور عالی گوہر کے درمیان جنگ ہوئی تو موزوں اس وقت صادق علی کا ملازم تھا۔ پھر جب ۱۱۷۴/۱۷۶۱ میں جعفر علی کے داماد نواب قاسم علی خان نے نظامتِ بنگالہ سنبھالی تو اس نے موزوں کو صوبہ داری سے معزول کرکے قید میں ڈال دیا۔

ایک موقع پر جب اس دور کا ایک مشہور ایرانی شاعر شیخ علی حزیں عظیم آباد پہنچا تو موزوں اس کے پاس گیا اور اسے اپنا دیوان دکھایا۔ اسی حزیں نے اس کے لیے موزوں کا تخلص تجویز کیا تھا۔ بعد میں قاسم علی نے موزوں کی دوسری جائداد کے علاوہ اس کا یہ دیوان بھی ضبط کر لیا۔ کچھ عرصے بعد کسی نے بکھرے ہوئے مسودات وغیرہ اکٹھے کر کے اس کا دیوان ترتیب دیا۔ غلام حیدر بلگرامی کے مطابق قاسم علی نے اسے ۱۱۸۷/ ۱۷۷۳ میں گنگا میں غرق کرا دیا تھا، لیکن شفیق اورنگ آبادی کا کہنا ہے کہ وہ عظیم آباد میں جب کہ وہ انچاکوٹ ثانی کا صوبے دار تھا فوت ہوا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی کہی ہوئی اس کی یہ تاریخ وفات بھی دی ہے:

بگو موزون فایق رفت افسوس (۱۱۸۷) [۵۶]

بلگرامی نے لکھا ہے کہ موزوں صاحب دیوان شاعر ہے اور لمبی لمبی غزلیں کہتا ہے [۵۷] شفیق نے اس کے کلام کا جو انتخاب دیا ہے، اس میں زیادہ تر صنائع کا استعمال نظر آتا ہے؟ ممکن ہے خود میر احسان علی بلگرامی، جس نے شفیق کو کچھ انتخاب کلام موزوں کا بھیجا تھا، یا شفیق صنایع کا دلدادہ ہو اور اس نے اپنے ذوق کے مطابق ایسے اشعار منتخب کیے ہوں۔ بہر حال موزوں کا اپنا دعوی یہ ہے کہ اس کی شاعری موتیوں کی لڑی ہے اور اس کے کلام کو آب گہر کے ساتھ لکھا گیا ہے:

سخن چو عقد لآلی ز کلک موزوں ریخت نوشتہ اند ز آب گہر کلام مرا

انتخاب:- شب کہ دل بے روی جاناں نالہ ہای زار داشت شمع ہم بر حالت او گریہ بسیار داشت

(رات جب دل محبوب کے چہرے سے دوری کے سبب شدید نالہ و زاری کر رہا تھا تو اس وقت شمع کو بھی اس کی اس حالت پر بڑا رونا آیا)۔

صد قیامت بجہان از قد رعنای ہست فتنہ ہا در نظر از نرگس شہلای ہست

تا کجا در پی دگراں خواہی بود ـ! عیب خود بیں اگرت دیدۂ بینای ہست

● ــــ محبوب کے قد رعنا سے دُنیا میں سیکڑوں قیامتیں برپا ہیں۔ اس کی نرگس شہلا کے ہاتھوں

---

۵۶ تذکرۂ گل رعنا، فصل دوم صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸

۵۷ ایضاً ص ۱۴۲

نظر میں فتنوں نے سر اٹھا رکھا ہے ۔

● ___ تو کب تک دوسروں کے عیب ڈھونڈتا رہے گا ، اگر تو دیدۂ بینا رکھتا ہے تو اپنے عیبوں پر نظر کر۔

آشفتہ شد دماغ من از بوی نو بہار — یا رب کجاست عطرِ نسیمِ دیارِ دوست

(نو بہار کی خوشبو سے میرا دماغ آشفتہ ہو گیا ۔ یا رب دیارِ دوست کی نسیم کی خوشبو کہاں ہے ؟

شیشۂ مارا ز سنگ سُرمہ گویا ساختند — دل فتاد از طاقِ ابرویش صدائے بر نخواست

(ہمارا شیشہ شاید سنگِ سرمہ سے بنا ہے ، اسی لیے جب ہمارا دل اس کے ابرو کے طاق سے گرا تو اس سے کوئی آواز پیدا نہ ہوئی) ۔

اردو کے کسی شاعر کا شعر ہے :

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

موزوں کے یہاں اس سے کسی حد تک ملتا ہوا ایک شعر ہے ۔ جس میں نصیحت کی بجائے ڈانٹ کا عنصر ہے :

گردنِ دعویٰ مکن اے شمع در محفل بلند — رونقِ حُسنِ تو آخر تا سحر خواہد شکست

(اے شمع دعویٰ کی گردن محفل میں بلند نہ کر کہ تیرے حُسن کی رونق صبح تک ماند پڑ جائے گی) ۔

یا تو موزوں کو شمع سے کوئی خاص لگاؤ رہا ہے یا پھر انتخاب کرنے والے کی اپنی دلچسپی اس سے ہے جو اُس کے یہاں اس (شمع) پر کئی اشعار ملتے ہیں :

از اشک و آہ تا سر و کارم فتادہ است — آتش چو شمع در تنِ زارم فتادہ است

(جب سے مجھے اشک و آہ سے واسطہ پڑا ہے ، شمع کی مانند آگ میرے تنِ زار میں لگی ہوئی ہے) ۔

کی تواں از دولتِ ناجنس گشتن بہرہ یاب — چارۂ افلاسِ کس از درہم ماہی نہ شد

(ناجنس کی دولت سے کیونکر بہرہ مند ہوا جا سکتا ہے ۔ مچھلی کے درہم (فلس یعنی مچھلی کا چھلکا) سے کسی کی غربت دور نہیں ہوئی ۔

چہ خوش می گفت روزی از ہجوم درد عریانے — کہ دل را چاک باید کرد گر نبود گریبانے

(ایک روز درد کے مارے کسی برہنہ شخص نے کیا خوب کہا کہ اگر کوئی گریبان میسر نہیں تو دل کو چاک کر ڈالنا چاہیے) ۔

بے غم

سرخوش میرزا کے مطابق اس کا نام بھونت رائے تھا جب کہ شفیق اورنگ آبادی کے مطابق بھوپت رائے تھا۔ بے غم تخلص، قوم کا کھتری تھا۔ آباواجداد قصبہ پنہان (پنجاب کا ایک قصبہ) میں قانون گو تھے۔ بے غم عاشق مزاج اور واقعی بے غم تھا۔ ہر انسان کے اندر کچھ بننے کی اہلیت وصلاحیت ہوتی ہے، جسے چنگاری سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ کوئی حادثہ یا واقعہ اس چنگاری کو شعلہ جوالہ بنانے کے لیے ہوا کا کام کرجاتا ہے۔ چنانچہ بے غم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اتفاق سے اس کا دل ایک ہندو لڑکے پر ریجھ گیا، اور پھر جلد ہی اس نے ترکِ دنیا کرکے لباسِ فقر پہن لیا اور اسی لڑکے کے ہم نام ایک بیراگی نرائن رام کا مرید ہوکر فرقہ بیراگیاں میں داخل ہوگیا جو ہندو درویشوں کا ایک فرقہ ہے۔ یوں وہ مجاز سے حقیقت کی طرف مائل ہوا۔ سرخوش نے اس کے بارے میں لکھا ہے: فردے ست از علایقِ دنیوی برجستہ واز قید ما ومنی و توئی رستہ" (وہ دنیادی علائق سے آزاد اور "ہم"، "میں" اور "تو" کی قید سے بری انسان ہے)

شروع شروع میں وہ میرزا افضل سرخوش سے اپنے کلام کی اصلاح لیتا رہا۔ سرخوش، جیسا کہ شفیق نے لکھا ہے "سرخوشِ جامِ توحید بود"۔ جس کے سبب بے غم کی اس کے ساتھ اکثر مسئلۂ وحدت پر بھی گفتگو رہتی۔ آخری عمر میں اس کی قوتِ سمع جاتی رہی۔ اگر اسے کچھ سننا ہوتا تو کاغذ پر لکھوالیتا۔ بہت سی تصنیفات اس سے منسوب ہیں۔ ایک ہندی کتاب کے علاوہ، جو اس نے اپنے ہندو محبوب کے نام پر لکھی، قصصِ فقرا ۱۶ ہند (مثنویات کی صورت میں) اور قصۂ بام دیو خاص طور پر مشہور ہیں۔ موخرالذکر کتاب کے اشعار بقولِ صاحبِ گل رعنا (ص ۳۳) بابا نانک کے گرنتھ میں شامل ہیں۔ اس کا کلیات پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جن میں سے غزل اور رباعی کے اشعار کی تعداد چھ ہزار اور باقی مثنویات کی صورت میں ہیں۔ تذکرۂ خوش گو کے مطابق بے غم نے ۱۱۳۲/ ۱۷۲۰ میں وفات پائی۔ ذیل میں دیے گئے مختصر سے انتخاب سے اس کے عقیدۂ وحدت الوجود اور تصوف وغیرہ کا بخوبی پتا چل سکتا ہے:

درفضای عشقِ جاناں بوالہوس را کار نیست — ہر سرے شایستۂ سنگ وسزاے دار نیست

دل چو شد بیکار دست از کار باید داشتن — کار در بیکاری دل بود دیگر کار نیست

● عشقِ محبوب کی فضا میں بوالہوس کو دخل نہیں۔ ہر سر پتھر اور دار کا سزاوار نہیں۔
جب دل بے کار ہوگیا تو کام سے ہاتھ اُٹھا لینا چاہیے۔ کام دل کی بے کاری میں تھا، اب کوئی اور کام نہیں۔

ہمچو صبح از جیبِ دل خورشید می آید بروں — وہ چہ جام است این کزو جمشید می آید بروں

صبح کی مانند دل کے دامن سے خورشید طلوع ہو رہا ہے۔ واہ یہ کیسا جام ہے کہ اس میں سے جمشید باہر آرہا ہے۔

مدہ از دست دامانِ یقین وصل ار میسر نیست — کہ ایں مشاطہ ہم در خوبی از معشوق کمتر نیست

اگر وصل میسّر نہیں تو بھی تُو یقین کا دامن ہاتھ سے نہ دے کیونکہ یہ مشاطّہ بھی خوبی میں معشوق سے کمتر نہیں ہے۔

رباعیات:

با دہریہ گفتم کہ گرت فہم و ذکاست — حرفِ من و تو ہیچ نمی آید براست
تو منکرِ خالقی و من منکرِ خلق — بنگر کہ تفاوت ز کجاتا بہ کجاست

میں نے ایک دہریے سے کہا کہ اگر تجھ میں فہم و ذکا ہے تو میری اور تیری بات کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ تو خالق کا منکر ہے اور میں خلق کا منکر ہوں۔ ذرا دیکھ کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔

رفتم سحرے بہ پیشِ زاہد ناگاہ! — پُرسیدم ازو کہ چیست کیفیّت راہ
گفتا کہ ہمیں صوم و صلواۃ است اینجا — برگشتم و گفتمش کہ اللہ اللہ

میں ایک صبح اچانک زاہد کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ کیفیتِ راہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس دُنیا میں یہی صوم و صلاۃ ہے۔ میں واپس مڑا اور اس سے کہا کہ اللہ اللہ۔

دریا در موج و موج اندر دریاست — در ذات و صفاتِ حق تفاوت ز کجاست
اے محوِ حقیقت نظر افگن بہ مجاز — بیرنگ بصد رنگِ جہاں جلوہ نماست

دریا موج میں اور موج دریا میں ہے۔ خدا کی ذات اور صفات میں فرق کہاں ہے؟ اے حقیقت میں گُم انسان مجاز پر نظر ڈال۔ بے رنگ دُنیا کے سینکڑوں رنگوں میں جلوہ گر ہے۔

ای آنکہ ترا ہوائے معنی است بسر — زنہار ز آیئنۂ صورت مگذر

صورت آیئنہ است و معنی تمثال   بے آئینہ کے فتد بہ تمثال نظر

اے کہ تیرے سر میں حقیقت کا سودا سمایا ہوا ہے، زنہار ظاہر کے آئینے سے تعلق نہ توڑنا ظاہر گویا آئینہ ہے اور حقیقت شکل۔ آئینے کے بغیر تمثال پر کیونکر نظر پڑ سکتی ہے ۔

حیا

لالہ سیورام داس اکبرآبادی۔ اس کا باپ رائے بھوکتی مل، اورنگ زیب عالمگیر کے وزیر اعظم اسد خان کے خاص پیش کاروں میں سے تھا اور قوم کا کائستھ اونایہ تھا اور شاعری میں نشاط تخلص کرتا تھا۔ حیا کو قدرت کی طرف سے ذہن رسا اور طبع بلند کی دولت ودیعت ہوئی تھی۔ ہم چشموں میں اس کی بڑی عزت و تکریم تھی۔ میرزا بیدل سے اصلاحِ سخن لیتا تھا۔ اپنے استاد کی کتاب "چہار عنصر" کی مانند حیا نے بھی نثر میں ایک کتاب "گلگشت بہار ارم" لکھی۔ عجیب کافر تھا، اپنے اشعار کے اوپر "الحیاءمن الایمان" لکھا کرتا۔ تذکرۂ خوشگو کے مؤلف نے اس سے اپنی ملاقات کے ذکر میں ایک جگہ اس کی انتہائی شعر فہمی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اُس کے مطابق اُس نے اپنا مطلع حیا کے سامنے پڑھا۔ اس نے فوراً کہا کہ عبارت اُلٹی باندھی گئی ہے۔ اس سے چشم کی تعریف کی بجائے تنقیص ہوئی ہے۔ بقول خوشگو حیا کے اس اعتراض نے اسے متحیر کر دیا کیونکہ اس سے قبل وہ اپنے اُستاد اور دیگر شعرا کے سامنے یہی غزل پڑھ کر داد و تحسین حاصل کر چکا تھا۔ بعد میں جب خوشگو نے اپنے اُستاد سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ حیا نے واقعی ٹھیک کہا ہے۔ بشری تقاضے کے سبب یہ عیب میری نظر میں نہ آسکا۔

بے چارہ جوانا مرگ ہوا۔ کچھ اوپر چالیس برس کی عمر پا کر ۱۱۴۴/۲۔۱۷۳۱ء میں اکبر آباد (یعنی آگرہ) ہی میں عالم بقا کو سدھارا۔ خوش گو نے اس کا جو طویل انتخاب دیا ہے۔ شفیق نے وہی انتخاب اپنی کتاب تذکرۂ گل رعنا میں دے دیا ہے (ملاحظہ ہو صفحات ۵۰۔۵۶)۔ اس کے کلام میں بھی تصوف کی چاشنی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ پہلے شعر میں بلا شبہ ایک اچھوتا مضمون آگیا ہے۔ یہ دور تمثیل نگاری کا دور ہے۔ چنانچہ اس دور کے کیا مسلمان شعرا اور کیا ہندو شعرا سبھی اس انداز کے شیفتہ ہیں۔ اس انداز میں بعض اچھوتے اشعار بھی ملتے ہیں، اگرچہ اس کے شوق میں شعرا نے شعریت کی طرف توجہ کم ہی کی ہے۔ حیا کہتا ہے کہ ہم نے دامن سے جو خاک جھاڑی تھی وہ پھر ہمارے ہی گریبان میں ڈال دی گئی۔ اس کی مثال اس نے ساحلِ دریا کی گرد کی دی ہے جو ہر پھر کر دریا ہی کے دامن میں جا گرتی ہے۔

گردِ ساحل کی برون از دامنِ دریا رود　　　　در گریباں ریختند افشاندۂ دامان ما

وہ "درِ دل کشا" کی بالواسطہ تلقین کرتا نظر آتا ہے کہ محبوبِ حقیقی تک رسائی کا یہی نزدیک ترین راستہ ہے۔ اس سے ہٹ کر جو بھی دوسرا راستہ ہے وہ، اس کے نزدیک، غلط ہے:

نہ بُردی سر بہ جیب و پا بروں آوردی از دامن　　　　غلط کردی رہِ نزدیک را از دور بینی ہا

بیادِ چشم تو داریم مے پرستی ہا　　　　رسانده ایم بہ گردوں دماغ مستی ہا

تیری آنکھوں کی یاد سے ہم خوب مے پرستی کر رہے ہیں اور اس طرح ہم نے سرمستیوں کا دماغ آسمان تک پہنچا دیا ہے۔

گردید پُر فشاں چہ زوادی غبار ما　　　　عمریست می کشد دلِ ما انتظارِ ما

جامے زِ اشکِ حسرتِ خود بہ کہ پُر کُنیم　　　　ساقی شکست شیشہ بجائے خمارِ ما

چوں ذرّہ رُو بہ منظرِ خورشید بردہ ایم　　　　از شش جہت یک آئینہ باشد دوچارِ ما

● ـــــ کس وادی سے ہمارا غبار اُڑ گیا کہ ایک مدت ہو چلی ہے۔ ہمارا دل ہمارا منتظر ہے۔

بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے اشکِ حسرت سے جام بھر لیں، کیونکہ ساقی نے تو ہمارے خمار کی بجائے جام ہی توڑ ڈالا ہے۔

ذرّے کی مانند ہم منظرِ خورشید کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ شش جہت سے ایک آئینہ ہمارے روبرو ہے۔

خجلت کشِ پیمانۂ صہبائے ظہوریم　　　　آب است گر از سنگ برآید شررِ ما

پس ماندہ زِ بے طاقتیِ خود چہ بَرَد پیش　　　　یا رب بہ رفیقاں کہ رساند خبرِ ما

ہم بادۂ ظہور کے جام کی شرمندگی اُٹھانے والے ہیں۔ اگر پتھر سے ہمارا شرر نکلے تو وہ بھی پانی بن جاتا ہے۔

تھکا ہارا اپنی بے طاقتی کے سبب آگے کیا بڑھے گا، یا الٰہی کون ہمارے ساتھیوں کو ہماری خبر دے گا۔

جز درد و داغ حاصلِ انساں چہ بودہ است　　　　در خاک و خوں نشاند فلک ایں نہال را

در شہد چوں فتاد مگس حالتش مپرس　　　　بر لعلِ یار قافیہ تنگ است خال را

● درد و داغ کے سوا انسان کا حاصل اور کیا ہے۔ آسمان نے یہ پودا خاک و خون میں لگایا ہے۔ مکھی جب شہد میں گر جائے تو پھر اس کی حالت مت پوچھ۔ کچھ اسی طرح محبوب کے لعل پر خال کا قافیہ تنگ ہے۔

بسعی غیر سے نمی گذارم زغیرتِ طبع کارِ خود را   چو صبح بر چرخ می رسانم بدامنِ خود غبارِ خود را

● میں اپنی غیرتِ طبع کے باعث اپنا کام کسی دوسرے کی کوشش پر نہیں ڈالتا۔ میں تو صبح کی مانند اپنا غبار اپنے ہی دامن سے آسمان تک پہنچاتا ہوں۔

تنہا نہ ہمیں بہ سرِ مژگانِ تر آید   از ہر بنِ مویم چو عرق اشک بر آید

از وادیٔ دلدار رہ آوردِ دگر نیست   اے وائے زپائے من اگر خار بر آید

صرف پلکوں ہی پر آنسو نہیں آئے ہوئے بلکہ میرے بالوں کی ایک ایک جڑ سے پسینے کی مانند آنسو باہر آ رہے ہیں۔

محبوب کی وادی سے اس کے سوا کوئی اور تحفہ نہیں ہے۔ افسوس کی بات ہوگی اگر میرے پاؤں سے کانٹا نکل جائے۔

چناں کہ دلو بزورِ رسن ز چاہ بر آید   ز سینہ لختِ دلِ من بسعیِ آہ بر آید

● جس طرح ڈول رسّی کے زور سے کنوئیں سے باہر آتا ہے، اُسی طرح سینے سے میرے دل کا ٹکڑا آہ کی کوشش سے باہر آتا ہے۔

یہ بات اِن شعرا کے یہاں خاص طور پر لائقِ توجہ ہے کہ تصوف کی چاشنی کے علاوہ اکثر قرآنی تلمیحات سے بھی اُنھوں نے استفادہ کیا ہے۔ جیاؔ کا ایک ایسا ہی شعر ملاحظہ ہو۔ جس غزل سے یہ شعر لیا گیا ہے اس کی بحر مشکل ہے، اور ایسی بحر کا استعمال ایک مشّاق شاعر ہی کر سکتا ہے:

ز تشنہ کامیِ یعقوبِ من اگر شود آگہ   بنازِ یوسفِ مصر آب ہم زچاہ بر آید

● اگر اسے میرے یعقوب کی تشنہ کامی کی خبر ہو جائے تو پانی بھی یوسفِ مصر کے ناز میں (ناز برداری کے لیے) کنوئیں سے باہر آ جائے۔

سعدی کہتا ہے کہ میں نے سوچا تھا کہ اے محبوب جب تو آئے گا تو میں تجھ سے اپنا غم دل بیان کروں گا، لیکن کیا بیان کروں کہ جب تو آتا ہے تو غم ہی دل سے غائب ہو جاتا ہے۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم | چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

حیاؔ کے یہاں یہی مضمون با نداز دگر نظر آتا ہے اور اس کی اپنی ایک تاثیر ہے۔ کہتا ہے کہ جب اس کی آنکھوں سے نگاہ عذر خواہ بن کر نکلتی ہے تو اس کے سو سالہ تغافل کا غم میرے دل سے نکل جاتا ہے:

غمِ تغافلِ صد سالہ می رود ز دلِ من | حیاؔ نگاہ ز چشمش چو عذر خواہ بر آید

چھوٹی بحر میں کہے گئے بعض اشعار جہاں سہل ممتنع کے حامل ہیں، وہاں ان میں ایک خاص جاذبیت بھی ہے۔ یہ دو شعر لائق توجہ ہیں:

ابر اگر باشد و شراب نباشد | بد تر ازیں در جہان عذاب نباشد

توبہ زمی کردہ ام بہ گفتۂ ناصح | لیک بشرطے کہ ماہ تاب نباشد

● ــــ اگر بادل چھایا ہوا اور شراب نہ ہو تو دنیا میں اس سے بدتر کوئی عذاب نہ ہوگا۔

میں نے ناصح کے کہنے پر توبہ تو کی ہے لیکن اس شرط پر کہ جب چاندنی نہ ہوگی۔

اور یہ شعر بھی شعر اول ہی کی صدائے بازگشت ہے:

ابر می آید و دل می برد از دست امروز | می تواں بے مددِ بادہ شدن مست امروز

● ــــ بادل چھا رہا ہے اور اس منظر سے دل آج ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ آج شراب کے بغیر ہی مست ہوا جا سکتا ہے۔

لیکن اردو کا شاعر رندؔ اس معاملے میں کچھ اور ہی نظریہ رکھتا ہے:

سر پہ مستوں کی طرح جھوم کے چھائے بادل | مفتیٔ شہر کا فتویٰ ہے کہ آئے بوتل

البتہ غالبؔ نے ہوا سے وہی کام لینا چاہا ہے جو حیاؔ نے بادل سے لینے کی کوشش کی ہے:

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر | بادہ نوشی ہے بادپیمائی

حیاؔ نے اخلاقیات کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ کہیں اس نے بالواسطہ اخلاق کی تعلیم دی ہے تو کہیں بلاواسطہ۔

بہ دہر آئینِ خوش معاشی کجاست جز وضعِ دل خراشی۔ غبارِ خاطر اگر نباشی کسے بروی تو در نبندد

دنیا میں سوائے دل خراشی کی وضع کے خوش معاشی کا دستور کہاں ہے۔ اگر تو دوسروں کے لیے غبار خاطر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی تجھ پر اپنا دروازہ بند نہ کرے گا۔

نہ گویمت کہ دل از فکرِ خانماں بردار | نیاید آنچہ بکارِ تو دل از آں بردار
ز خلق چشمِ حصولِ امید بے خردی ست | ز غیر اگر نتوانی ز دوستاں بردار

میں تجھے یہ تو نہیں کہتا کہ اپنے گھر بار کے فکر سے آزاد ہو جا لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو چیز تیرے کام کی نہیں اس سے تو دل ہٹا لے۔

لوگوں سے کسی اُمید کے حصول کی توقع رکھنا نادانی ہے۔ اگر تو غیر سے ایسی توقع اُٹھا نہیں سکتا تو دوستوں ہی سے اُٹھا لے۔

خوشگو بندرابن داس نام۔ ہندوؤں کی ذات بیس سے اس کا تعلق تھا۔ فارسی شعرا کے مشہور تذکرے "تذکرۃ الشعرا" کا مؤلف ہے۔ متھرا کا رہنے والا تھا۔ اس دور کے بڑے بڑے فارسی گو شعرا مثلاً میرزا عبدالقادر بیدل، افضل سرخوش اور گلشن وغیرہم کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ اپنا کلام خانِ آرزو کو دکھایا کرتا تھا۔ مذکورہ تذکرہ اس نے عمدۃ الملک امیر خان انجام کے نام معنون کیا، جس کے صلے میں اس نے تمام الہ آباد کے محصول پر دو روپیہ یومیہ اس کے نام جاری کر دیا، جو نواب کی زندگی تک خوش گو کو ملتا رہا۔ آغاز میں مختلف ملازمتوں میں الجھا رہا، لیکن بعد میں دُنیا داری ترک کر کے فقرا کی زندگی بسر کرنے لگا۔ زیادہ تر الہ آباد، بنارس اور عظیم آباد ہی میں اس کی زندگی بسر ہوئی۔ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء میں عظیم آباد کے مقام پر راہی ملک عدم ہوا۔ خوش گو نے اپنے تذکرے میں شیخ سعدالدین اختر کے ذیل میں اس کے شعر پر اپنے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے جس انداز میں اپنے اس فعل کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے وہ اس کی عظمت کردار کی غمازی کرتا ہے۔ شفیق اورنگ آبادی نے اسے رنگین نوا بلبل کے لقب سے یاد کیا ہے[۵۸] اس کے کلام میں عشق و عاشقی کی باتوں کے علاوہ اپنے دور کے بعض معاملات و حالات پر طنز بھی ہے۔ کہیں کہیں اس نے شوخی سے کام لیا ہے، اپنی بات میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے وہ یہاں کے ماحول سے متعلق مختلف الفاظ اپنے اشعار میں کھپاتا ہے۔ دوسرے ہندو شعرا کی طرح اس نے بھی اسلامی اور قرآنی تلمیحات سے استفادہ کیا ہے۔ اور یہ غالباً مسلمان اساتذہ کے کلام کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے کہ فارسی گو ہندو شعرا کسی حد تک اسلامی تعلیمات سے براہِ راست بہرہ ور ہوتے ہوں۔ بہر حال اپنے کلام میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر خوشگو نے ان تلمیحات کے ساتھ ساتھ اپنی اپج کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے دور کے بخیلوں پر اس کا طنز، فنی سادگی کے باوصف، خاصی کاٹ کا حامل ہے۔ کہتا ہے کہ اگر ہمارے دور کے بخیلوں کے بُخل کی معراج یہ ہے تو اسے خدا تو قارون کو اپنے بحرِ رحمت میں غریق فرما:

اگر معراجِ بخل ممسکانِ دورِ ما اینست   خداوندا غریقِ بحرِ رحمت ساز قاروں را

---

۵۸ تذکرہ گلِ رعنا۔ ص ۶۵

چند اشعار

مرکّب از سوادِ دیدۂ یعقوب کن خوشگو   رقم سازی اگر تاریخ مشتاقانِ محزوں را

● ــــ خوشگو اگر تجھے غم زدہ عشاق کی تاریخ رقم کرنا ہے تو اس کے لیے حضرت یعقوب کی آنکھوں کی سیاہی سے روشنائی کا کام لے۔

قامتِ خم گشتہ آفت گاہِ دیگر بودہ است   بر سرِ ما عاقبت می افتد ایں دیوارِ ما

● ــــ جھکا ہوا قد ایک اور ہی آفت کا سامان کرتا ہے۔ ہماری یہ دیوار آخر ہمارے ہی سر پر آ گرتی ہے۔

نگہ در توتیا غلطیدہ می خیزد ز مژگانش   سخن پان خوردہ می آید بروں از رنگِ آں لب ہا

● ــــ نگاہ سُرمے میں لڑھک کر اس کی پلکوں سے اُٹھتی ہے۔ بات پان کھا کر اُن ہونٹوں کی سُرخی سے باہر نکلتی ہے۔

چُو رنجے کہ بہ گردد از قطعِ عضو   بہ عشقِ تو شد درد درمانِ ما

● ــــ اس تکلیف کی مانند جو عضو کٹنے سے دور ہو جاتی ہے، تیرے عشق میں درد ہمارا درمان بن گیا ہے۔

واعظ مطلب علم و ادب از منِ بیخود   من علم ندارم ز خود اللہ علیم است

● ــــ واعظ تو مجھ بیخود سے علم و ادب کا طالب مت ہو۔ میں اپنے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا، اللہ علیم ہے۔

غرض ہر جا کہ منظور است ہر عیبے ہنر باشد   دلِ شہزادگاں را آرزو مرگِ پدر باشد

● ــــ جہاں بھی غرض پیشِ نظر ہو گی وہاں ہر عیب ہنر بن جائے گا۔ باپ کی موت شہزادوں کی آرزو ہوتی ہے۔

تابوتِ مرا از تو گُلِ فاتحہ نیست   ایں رسمِ کہن حیف بعہدِ تو برافتاد

● ــــ میری میّت کے لیے تیری طرف سے فاتحہ کے پھول نہیں ہیں۔ افسوس کہ تیرے عہد میں یہ پُرانی رسم بھی اُٹھ گئی۔

موجود گر نبودیم معدوم ہم نبودیم   امروز از کجا ایم گر در عدم نبودیم

—— اگر ہم موجود نہیں تھے تو معدوم بھی نہیں تھے۔ آج ہم کہاں سے آئے ہیں اگر ہم عدم میں نہ تھے۔

می کشد عاشقانہ ناز ترا　　　گرچہ نازک بود مزاج سخن

اس کے ترجمے کی بجائے اس سے ملتا جلتا احمد ریاض کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ اور بات غم دہر سہہ گئے ورنہ　　　تری نظر کے اشارے بھی مار جاتے ہیں

شفیق

فارسی میں لکھے گئے اردو کے مشہور تذکرہ شعرا "چمنستان شعرا" فارسی شعرا کے تذکرہ گل رعنا اور شام غریباں کا مؤلف و مصنف لچھمی نارائن ماتھر۔ اس کا دادا لاہور کا رہنے والا تھا۔ عالمگیری فوج کے ساتھ دکن گیا اور اورنگ آباد میں آباد ہو گیا۔ یہیں شفیق کا والد منسا رام پیدا ہوا، جو دس برس کی عمر میں یتیم ہو گیا، اور کسی عزیز کے ہاں تربیت پا کر اسی کے وسیلے سے سرکار میں ملازم ہو گیا۔ شفیق ۲۔صفر ۱۱۵۸/ مارچ ۱۷۴۵ میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوا۔ سن شعور کو پہنچا تو میر غلام علی آزاد بلگرامی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ نواب صمصام الدولہ کے دورِ اقتدار میں "دولت چند" کے خطاب سے نوازا گیا اور منصب پر سرفراز ہوا۔

شروع شروع میں اس نے صاحب تخلص کیا لیکن ۱۱/۳/۱۷۶۲ میں آزاد بلگرامی نے اس کے لیے شفیق تخلص تجویز کیا۔ اس نے ہندی اور اردو اشعار میں تو اول الذکر تخلص ہی برقرار رکھا البتہ فارسی میں شفیق کے تخلص سے لکھنا شروع کیا، تاہم فارسی اشعار میں ضرورت کے تحت اس نے صاحب بھی استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول شفیق اپنے عہد کی سب سے نامور اور مہتم بالشان شخصیت تھا، فارسی کی تعلیم شیخ عبدالقادر سے حاصل کی۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہہ سکتا تھا۔ عبدالقادر کے بعد آزاد کی شاگردی اختیار کی[۵۹]۔ ۱۲۲۳/۱۸۰۸ میں فوت ہوا۔ بہت سی تصانیف اس سے یادگار ہیں۔

شفیق نے اپنے مشہور تذکرہ گل رعنا کی دوسری فصل میں جو شعراے ہنود کے احوال پر

۵۹　ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲ ص ۹۶، ۱۰۹

مشتمل ہے، اپنا ایک طویل انتخاب دیا ہے، اور ہمارا انتخاب اسی سے ماخوذ ہے۔ شفیق کے یہاں دوسرے ہندو شعرا کی نسبت تصوف سے دلچسپی کا عنصر کم نظر آتا ہے۔ عشق و رندی، شیخ و واعظ سے چھیڑ چھاڑ اور اسی قسم کے دوسرے مضامین میں اس نے سادہ انداز میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی بعض غزلیں حافظ اور دیگر کلاسیکی شعرا کی غزلوں کی زمینوں میں ہیں۔ اس نے تمثیل نگاری کی بجائے سادہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ دیگر ہندو شعرا کی طرح اس کے کلام سے بھی یہ پتا نہیں چل پاتا کہ یہ کسی ہندو کا کلام ہے، وہی مسلمانوں کی تلمیحات اور وہی اسلامی مزاج کی عکاسی اور مسلمان اساتذہ کی سی تشبیہات و استعارات ترکیبات اور لفظیات۔ کہیں کہیں بڑا استادانہ شعر آگیا ہے اور کہیں مضمون کے انوکھے پن نے شعر کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ خمریات کی طرف بھی اس نے توجہ کی ہے۔

مصرعِ ابروے او بسم اللہ عنوانِ ما مصحفِ رخسارۂ او دینِ ما ایمانِ ما

اس کے ابرو کا مصرع ہمارے عنوان کی بسم اللہ ہے۔ اس کے چہرے کا مصحف ہمارا دین اور ہمارا ایمان ہے۔

فزود جلوۂ او سیلِ گریۂ ما را طلوعِ ماہ کند بیش آبِ دریا را

● ـــــ اس کے جلوے نے ہمارے سیل گریہ میں اضافہ کر دیا۔ چاند کے طلوع ہونے سے سمندر کا پانی بڑھ جایا کرتا ہے۔

والۂ نقش و نگار خود ز بس افتادہ است می کشد تصویرِ خود را ہر زماں بہزادِ ما

● ـــــ ہمارا بہزاد اپنے نقش و نگار کا کچھ اس قدر شیفتہ ہے کہ ہر لمحہ اپنی تصویر بنا تا رہتا ہے

تعالی اللہ چہ دولت شد میسر ناگہاں امشب کہ آمد بر سرِ بالینِ من آں جانِ جہاں امشب

● ـــــ سبحان اللہ، آج رات اچانک نصیبہ کیسا جاگ اٹھا کہ وہ جانِ جہاں میرے سرہانے جلوہ افروز ہوا۔

ہم آغوشم بہ جاناں طالعِ بیدار را نازم مگر در خوابِ نوشین است چشمِ آسماں امشب

چو گل ریزے کہ ریزد بر زمیں گلہاے آتش را مرا افتاد لختِ دل ز چشمِ خوں چکاں امشب

● ـــــ دوست آج ہم آغوش ہے، میں اپنے بیدار نصیبے پر نازاں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے آسمان کی آنکھ آج رات میٹھی نیند میں غرق ہے۔

اس گلریزہ (گلابی) کی مانند جو زمین پر آتش کے پھول گراتی ہے، میرے دل کے ٹکڑے آج کی رات خوں چکاں آنکھوں سے ٹپک پڑے ۔

غنچہ ہا بشگفت و طفلِ گل عذارم بر نگشت — صد گریباں پارہ شد دامن سوارم بر نگشت
گریہ می آید مرا بر حالِ خود در فصلِ گل — گشت آبِ رفتہ در جوئبارم بر نگشت
گر جہاں بر گشت از من نیست پروایم شفیقؔ — شکر ایزد را کہ از من گل عذارم بر نگشت

● ـــــ کلیاں کھل اٹھیں لیکن میرا گلعذار محبوب لوٹ کر نہیں آیا ۔ سینکڑوں گریبان پارہ پارہ ہو گئے لیکن میرا دامن سوار (ایک کھیل جس میں بچہ خود کو سوار سمجھتا ہے) نہیں لوٹا ۔

فصلِ بہار میں مجھے اپنی حالت پر رونا آتا ہے کہ گذرا ہوا پانی تو ندی میں لوٹ آیا لیکن میرا محبوب نہیں لوٹا ۔

اگر دُنیا مجھ سے منہ پھیر لیتی ہے تو اے شفیقؔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا گلعذار مجھ سے نہیں پھرا ۔

۱ ۔ چہ ستم ہا بدل از چشمِ سیہ مستِ تو رفت — شیشۂ تحفہ صد افسوس کہ از دستِ تو رفت
۲ ۔ شکستِ توبۂ ما را بہار شد باعث — ہزار بار نوائے ہزار شد باعث
۳ ۔ دماغِ رفتن کوئے بتاں نبود مرا — ولے چہ چارہ، دلِ بیقرار شد باعث
۴ ۔ ظالماں را باشد از روزِ ازل کردار کج — ہست عقرب را دُمِ کج مار را رفتار کج
۵ ۔ بہار آمد و شد در چمن ہوائے قدح — بیار مے کہ دہم توبہ رونمائے قدح
۶ ۔ زیار بادہ طلب کن بوقتِ بارشِ ابر — کہ مستجاب شود ایں زماں دعائے قدح
۷ ۔ نمی گویم کہ بر من جور کن یا مرحمت فرما — بقدر بانت روم گاہے چناں گاہے چنیں باشد
۸ ۔ گر رسد فصلِ گل امسال چہ تدبیر شفیقؔ — نیست باقی ز گریباں بگلو تارے چند
۹ ۔ مصحفِ روئے تو ایمانِ دلِ صد کافر — ہندوئے خالِ تو اسلام مسلمانے چند
۱۰ ۔ دمے کہ شورِ جنوں آشکار خواہم کرد — ہزار جیب نثارِ بہار خواہم کرد
۱۱ ۔ براہِ مقدمِ آن آفتابِ عالم تاب — چو شبنم نگراں انتظار خواہم کرد
۱۲ ۔ غم نیست اگر از تو جفا شد، شدہ باشد — بر غیر نشد بر سرِ ما شد، شدہ باشد

۱۳۔ مارا کہ سر چیدن وبوکردن گل نیست — گر باد سحر غنچہ کشا شد، شدہ باشد

۱۴۔ از کف نہ دہم شیوۂ نیکوئی خود را — گر دشمن بدکیش زبوں شد، شدہ باشد

۱۵۔ ہزار شیشۂ دل را شکست و خود مخمور — کسے چو چشم سیاہ تو احتساب نکرد

ترجمہ:

۱۔ تری مست سیاہ آنکھوں کے ہاتھوں دل پہ کیا کیا ستم نہیں ٹوٹے۔ صد افسوس کہ شیشۂ تخفہ تیرے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

۲۔ ہماری توبہ ٹوٹنے کا باعث بہار ٹھہری ہے۔ ہزاروں مرتبہ بلبل کی نوا اس کا باعث بنی ہے

۳۔ حسینوں کے کوچے میں جانے کا دماغ مجھ کو نہ تھا، لیکن کیا کیا جائے کہ دل بے قرار اس کا باعث بنا۔

۴۔ ازل ہی سے ظالموں کا کردار کج رہا ہے، اسی طرح جیسے بچھو کی دُم اور سانپ کی رفتار کج ہوتی ہے۔

۵۔ بہار آئی اور چمن میں پیالے کی ہوا چلی۔ مے لا تاکہ میں پیالے کو توبہ رونمائی کے طور پر دُوں۔

۶۔ بادل برسنے کے موقع پر دوست سے مے طلب کر، کیونکہ اس لمحے پیالے کی دعا قبول ہوتی ہے۔

۷۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھ پر ستم کر یا مرحمت فرما، تیرے قربان جاؤں۔ کبھی ویسا ہو اور کبھی ایسا۔

۸۔ اگر اس برس فصلِ گل آئے تو اے شفیق کیا تدبیر ہوگی؟ کہ گریبان سے لے کر گلے تک چند تار بھی تو نہیں بچے۔

۹۔ تیرے چہرے کا مُصحف سینکڑوں کافروں کے دل کا ایمان اور تیرے تِل کا ہندو (حبشی یا کالا آدمی) چند مسلمانوں کا اسلام ہے۔

۱۰۔ جس لمحے میں شورِ جنوں آشکار کروں گا، ہزاروں دامن بہار پر نثار کر دوں گا۔

۱۱۔ اس عالمتاب آفتاب کی آمد کی راہ میں مَیں شبنم کی طرح انتظار کروں گا۔

۱۲۔ اگر تیری طرف سے جفا ہوئی ہے تو غم نہیں، ہوئی ہوگی۔ رقیب پر تو نہیں ہوئی ہم پہ ہی ہوئی ہے، ہوئی ہوگی۔

۱۳۔ ہمیں، کہ جنھیں پھول سونگھنے اور چننے کا دماغ نہیں ہے، کیا؟ اگر بادِ سحر نے کلی کِھلادی، کِھلادی ہوگی۔

۱۴۔ میں اپنا نیکی کا شیوہ نہیں چھوڑوں گا، اگر بدفطرت دشمن زار و زبوں ہوگیا ہے تو ہوگیا ہوگا۔

۱۵۔ تیری آنکھوں نے ہزاروں شیشہ ہائے دل توڑے اور خود مخمور رہیں، کسی نے بھی تیری سیاہ آنکھوں کی طرح احتساب نہیں کیا۔

حضوری

گربخش نام تھا، اور قوم کا کنبو۔ اس کے اسلاف ملتان کے رہنے والے تھے، لیکن اس نے ایک مدت تک متھرا میں سکونت اختیار کیے رکھی۔ خوش گو کے مطابق بڑا خوش خلق اور صاحبِ تمکنت تھا۔ دوستی میں کوہِ وفا تھا۔ شروع شروع میں اُس نے میر محمد معصوم مشرب سے تربیت پائی اور مدت تک بیدل سے اس کی صحبت رہی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کا سالِ وفات ۱۱۴۷/ ۵-۱۷۳۴ لکھا ہے [۵] اس نے نظامی کی مثنوی شیریں و خسرو کی زمین میں ایک منظوم داستان "کامروپ و کاملتا" لکھنا شروع کی تھی لیکن بقول شفیق وہ تذکرۂ گلِ رعنا کی تکمیل تک مکمل نہ ہوسکی تھی۔ اس کی طبیعت صنعت ایہام کی طرف بہت مائل ہے، چنانچہ غنی کاشمیری کے تقریباً ہر شعر کا اس نے جواب لکھا ہے۔

صنعت ایہام کا ایک اچھا شعر:

چشمِ بہبودی از اں سروِ سہی داریم ما　　　　این عجب کز سرو امیدِ بہی داریم ما

ہم اس سروِ سہی سے اچھائی کی توقع رکھتے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ہم سرو سے بہی (بہتری اور ایک پھل) کی امید رکھتے ہیں۔

من و بُتے کہ بہ ہنگامِ بادہ پیمائی　　　　زیاد اگر طلبم می بَرد زیاد مرا

• میں اور بُت بادہ نوشی کے وقت جب اکٹھے ہوتے ہیں تو اگر میں زیادہ شراب مانگتا ہوں تو وہ مجھے بُھلا دیتا ہے۔

۱۔ نالۂ بے اختیارم در محبت شہرہ کرد　　　　ہم چو آں مستے کہ رسوا سازدش بوئے شراب

---

[۵] ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲۔ ص ۱۷۵

۲- مقبلاں عیب نہ گیرید بروز سیہم — کاین سیہ روزی من روے زمین را خال است
۳- بکوے دوست رواں است کاروانِ سرشک — تو نیز گر روی اے دل غریب قافلہ ایست
۴- بہارِ عمر بہ غفلت تمام شد افسوس — رفو نکردم و چوں گل شدم گریباں چاک
۵- تا نظر کردیم در پاشیدنِ صحبت چو صبح — خندۂ بے اختیارے بر گل و شبنم زدیم
۶- نہ گلزارِ جہاں نے باغِ جنت در نظر دارم — برنگِ شمع از داغِ محبت گُل بسر دارم
۷- جہاں بدیدۂ حق بین غلط نداشتہ است — بہر چہ می نگرم انتخاب می بینم
۸- رسید بر سر بامِ آفتابِ من وقتے — کہ آفتاب رسیدا ست بر سرِ بامم

ترجمہ:

۱- مجھے بے اختیار نالے نے محبت میں مشہور کر دیا، اس مست کی طرح جسے بوے شراب رسوا کر دیتی ہے۔

۲- اے صاحبانِ اقبال میری سیاہ بختی پر عیب گیری نہ کرو، کیونکہ میری یہ سیاہ روزی زمین کے چہرے پر تل ہے۔

۳- اشکوں کا قافلہ دوست کے کوچے کی طرف رواں ہے۔ اے دل اگر تو بھی اس کے ساتھ ہو لے (تو خوب رہے کہ) یہ ایک عجیب قافلہ ہے۔

۴- افسوس کہ بہارِ عمر غفلت ہی میں کٹ گئی۔ میں نے گریبان نہ سیا اور یوں وہ پھول کی طرح چاک ہو کر رہ گیا۔

۵- جب ہم نے رفاقت کے ٹوٹ جانے پر نظر کی تو صبح کی مانند ہم نے گل و شبنم پر زور کا قہقہہ لگایا۔

۶- میری نظر میں نہ تو گلزارِ جہاں ہے اور نہ باغِ جنت۔ میں تو شمع کی طرح داغِ محبت کا پھول سر پر رکھے ہوئے ہوں۔

۷- حق بین نگاہوں میں اس دُنیا کی کوئی چیز بھی غلط نہیں ہے۔ میں تو جو چیز بھی دیکھتا ہوں، اسے منتخب ہی پاتا ہوں۔

۸- میرا آفتاب اُس وقت لبِ بام آیا جب میرے لبِ بام آفتاب آ پہنچا (مرنے کے قریب)

مخلص :

بدائع وقائع کا مصنف، نام رائے انند رام۔ راجہ ہردے رام کا بیٹا، قوم کا کھتری اور سودرہ کا باشندہ تھا۔ دلّی میں اس نے سکونت اختیار کی۔ بادشاہ سے "رائے رایاں" کا خطاب پایا۔ خوش گو کے مطابق آغازِ مشقِ سخن میں وہ میرزا بیدل سے اصلاح لیتا رہا۔ بعد میں خانِ آرزو سے اس کی شاعرانہ صحبتیں رہیں۔ خان آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں کہ بندہ کا دہلی میں مقیم رہنا اس (مخلص) کے اخلاص کے سبب ہے۔ ان تیس برسوں کی مدت میں ہمارے درمیان محبت و مودّت کا رشتہ ذرا بھی کمزور ہونے نہیں پایا[11]۔ ریاض الشعرا[12] کے مؤلف علی قلی خان والہ داغستانی کا کہنا ہے کہ برصغیر کی درباری روایت کے مطابق غائب اور حاضر امرا کے وکیل دربار میں موجود ہوتے ہیں، چنانچہ مخلص محمد شاہ کے وزیر نواب اعتماد الدّولہ قمر الدین کا وکیل تھا۔ اسی طرح اس نے صوبۂ لاہور و ملتان کے گورنر سیف الدولہ عبدالصمد خاں کی نمائندگی بھی کی۔ اس نے ۱۱۶۴/۱۷۵۱ میں وفات پائی۔

خوش گو کے مطابق اس کا دیوان غزلیات دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اور یہ اشعار معانی تازہ اور رنگین الفاظ سے پُر ہیں۔ مخلص نے غزلوں کے علاوہ مقفیٰ نثر میں ایک حکایت بھی لکھی ہے۔ علاوہ ازیں کسی مرقعہ کا ایک دیباچہ بھی اس سے یادگار ہے۔

مخلص کے یہاں زیادہ تر رندی و عاشقی کے مضامین ہیں، کہیں کہیں اس نے اس دور کے برصغیر کے سیاسی حالات سے بھی تشبیہہ و استعارے کی صورت میں استفادہ کیا ہے، اور غزل میں اس طرح کی بات اس وقت کے لحاظ سے کسی قدر انوکھی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ بعض اشعار میں مضمون کے علاوہ جدتِ تشبیہہ و استعارہ نے بھی عجیب تاثیر و دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اس کے بعض اشعار بڑے بولتے ہوئے اور پُر تاثیر ہیں اور اس نے بھی دیگر ہندو شعرا کی مانند اسلامی تلمیحات و روایات سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے۔ سیاسی صورت حال کے غمّاز یہ دو شعر ملاحظہ ہوں، اگرچہ دوسرے شعر میں رعایتِ لفظی کارفرما ہے، تاہم صورتِ حال کے بارے میں بات بن جاتی ہے:

---

۱۱ بحوالہ گل رعنا ص ۱۲۳

۱۲ ایضاً ص ۱۲۱، ۱۲۲

برد دل ما تیرہ روزاں زاں صفِ مژگاں گذشت — آنچہ از فوجِ دکن بر ملکِ ہندوستان گذشت
بہ تحریکِ نسیمے زلفِ او زیر و زبر گردد — ہزار افسوس امن از کشورِ ہندوستان گم شد

اس کی پلکوں کی صف سے ہم سیاہ بختوں کے دل پر وہی کچھ گذر گئی جو کچھ فوجِ دکن کے ہاتھوں ملکِ ہند پر گذری۔

بادِ نسیم کے ایک جھونکے سے اس کی زلفیں زیر و زبر ہو جاتی ہیں، ہزار افسوس کہ کشورِ ہند سے امن غائب ہو گیا۔

مخلص کے بعض اشعار میں بے ساختہ پن ہے، جو دوسرے ہندو شعرا کے یہاں کچھ کم ہی ہے۔

انتخاب :

۱۔ نہ دہد گر الم، جدائی ہا — چیز خوبی ست آشنائی ہا
۲۔ در جہاں از اصلِ کارِ ما کسی آگاہ نیست — ایں مرقع را مگر تصویرِ عنقائیم ما
۳۔ خوش نشینانِ خراباتیم مخلص دور نیست — ہم چو خُم با اہلِ تقویٰ گر نمی جوشیم ما
۴۔ می کُنی گاہے ز منظر جلوہ ٔ در کارِ ما — دار داو سبحانہ ٔ آباد دولت خانہ را
۵۔ بہ کوی پیرِ مغاں گشت رہنموں مارا — خدا نصیب کند عمرِ خضر، مینا را
۶۔ گذشتی از نظر و بے تو زندہ ایم ہنوز — ز شرم آب نگشتیم خاک بر سرِ ما
۷۔ چوں غزالاں فرقہ ٔ گردن کشے بودش مطیع — تہر ملنے ہیچو مجنوں کشورِ ہامون نداشت
۸۔ کارِ ہر کس نیست جادادن ترا بر سر چو گُل — بعد ازیں ای تیشہ سر بر سنگ زن، فرہاد رفت
۹۔ توبہ شوم است فصلِ گل گفتم — بعد ازیں اختیار یاراں است
۱۰۔ خوش نشینانِ چمن بارِ سفر می بندند — عندلیباں ہر یک جا شدہ فریاد کنید
۱۱۔ بگذشت بہار و زدم چاک چو گل جیب — دیوانگیم آہ بہ سالِ دگر افتاد
۱۲۔ گر مناسب نبُود آمدنم در کویت — بندہ پرور! اسرِ بازار سلامت باشد
۱۳۔ از قدش برپا قیامت در جہاں — گر نہ شد امروز فردا می شود

ترجمہ :

۱۔ اگر جدائی الم کا باعث نہ بنے تو آشنائی ایک اچھی چیز ہے۔

۲۔ دُنیا میں کوئی بھی ہمارے اصل کام سے واقف نہیں ہے۔ اس مرقع کے لیے ہم شاید عنقا کی تصویر ہیں۔

۳۔ مخلص! ہم خرابات کے خوش نشین ہیں، اس لیے اگر ہم خُم کی طرح اہلِ تقویٰ کے ساتھ جوش میں نہیں آتے تو یہ کوئی بعید نہیں ہے۔

۴۔ کبھی کبھی تو کھڑکی سے ہمیں اپنے دیدار سے نواز دیتا ہے، اللہ سبحانہٗ تیرا دولت خانہ آباد رکھے۔

۵۔ پیر مغاں کے کوچے کی طرف اس نے ہماری رہنمائی کی ہے، مولا کریم صراحی کو عمر خضر عطا فرمائے۔

۶۔ تو ہماری نظروں کے سامنے سے گذرا اور پھر بھی ہم اب تک زندہ ہیں۔ خاک ہمارے سر پر، ہم شرم سے پانی پانی کیوں نہ ہوگئے۔

۷۔ غزالوں کی طرح گردن کشوں کا ایک فرقہ اس کا مطیع تھا۔ مجنوں جیسے حاکم کے پاس ہاموں (دشت) کی مملکت نہ تھی۔

۸۔ تجھے پھول کی طرح اپنے سر پر جگہ دینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، اس لیے اسے تیشے (کلہاڑی) تو اس کے بعد پتھر پر سر مار، کیونکہ فرہاد تو چلا گیا۔

۹۔ میں نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ موسمِ بہار میں توبہ کرنا منحوس ہے۔ اب اس کے بعد دوست جانیں اور ان کا کام۔

۱۰۔ چمن کے خوش نشین اپنا سامان سفر باندھ رہے ہیں، بلبلو! تم سب اکٹھی مل کر فریاد کرو۔

۱۱۔ بہار آئی اور گذر گئی لیکن میں نے پھول کی طرح دامن چاک نہ کیا، افسوس کہ میری دیوانگی اب اگلے سال پر جا پڑی ہے۔

۱۲۔ اگر تیرے کوچے میں میرا آنا مناسب نہیں ہے تو بندہ پرور! سر بازار سلامت رہے۔

۱۳۔ اس کے قد سے دنیا میں قیامت اگر آج نہیں تو کل برپا ہو کے رہے گی۔

برہمن:

شاہ جہانی دور کا مشہور شاعر، رائے چندر بھان برہمن۔ لاہور کا رہنے والا تھا۔ اس دور کے مشہور عالم عبدالحکیم سیالکوٹی کے سامنے اس نے زانوے تلمذ تہ کیا۔ اسی دور کے ایک مشہور شاعر و نثر نویس منیر لاہوری نے اسے زبردست خراجِ تحسین و ستائش پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعض

مقاماتِ پر وہ مبالغے سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں اس کے لیے یہ القاب و الفاظ استعمال کرتا ہے۔ " اجلالِ خطِّ جبینِ فصاحت، نقشِ نگینِ بلاغت، سحبان العصر ، حسّان الزمان، ملک الشعرا چندر بھان۔۔۔"

اس کے آبا و اجداد نے مختلف مشاغل سے اپنی روزی کا سامان کیا۔ اس کا باپ دھرم داس منشی گری پر ملازم اور شاہی منصب داری میں صاحبِ امتیاز تھا۔ آخر میں اس نے گوشہ گیری اختیار کر لی تھی۔ شفیقؔ کے مطابق برہمن کے دو بھائی تھے، اودے بھان اور رائے بھان۔ مؤخر الذکر اور برہمنؔ نے تجرد اختیار کیا۔ رائے بھان اپنی لیاقت سے عاقل خان رازی کے یہاں ملازم ہو گیا اور اس کی وفات کے بعد اودے بھان نے ملازمت اختیار کر لی، جب کہ منشآت برہمن کے حوالے سے ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے مؤلف کا کہنا ہے کہ برہمنؔ کے تین بھائی تھے۔ اودے بھان، عاقل خان کے دربار میں متصدی تھا۔ باقی دو بھائی رائے بھان اور اندر بھان دینوی تعلقات سے علیحدہ ہو کر فقر و غنا کی زندگی بسر کرتے رہے[۱۳]۔

گل رعنا میں ہے کہ عاقل خاں کی وساطت سے برہمن، بادشاہ سے روشناس ہوا۔ آخری عمر میں ترک ملازمت کر کے بنارس میں مقیم ہو گیا اور وہیں اس نے ۱۰۷۲ / ۱۶۶۲-۳ میں وفات پائی[۱۴]۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق برہمن صوفی مشرب، سلیم المزاج اور صلح کل ہندو تھا۔ عمل صالح کے مؤلف نے ان الفاظ میں اس کی طبیعت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ " ہرچند بصورت ہندو است لیکن در معنی درِ اسلام می زند[۱۵]" (اگرچہ بظاہر وہ ہندو ہے لیکن حقیقت میں اسلام کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)۔ نیز یہ کہ اس کی آنکھیں ہر وقت تر رہتی تھیں ۔ دارا شکوہ اس کی بہت قدر افزائی کرتا تھا۔ اس کے

---

۱۳ بحوالہ گل رعنا، ص : ۲۷

۱۴ گل رعنا، فصل دوم ص ۱۱، بحوالہ بہارستان سخن از نواب شاہ نواز خاں شہید۔ تھامس ولیم بیل نے ۱۰۶۸ اور مرات الخیال کے حوالے سے یہی سال دیا ہے (مفتاح التواریخ مطبوعہ ۱۲۸۴، ص ۲۶۱)

۱۵ عمل صالح الموسوم بہ شاہ جہاں نامہ جلد سوم ص ۴۲۳

بارے میں کلمات الشعرا کے مؤلف محمد افضل سرخوش اور " سفینہ " کے مؤلف میر عظمت اللہ بیخبر نے ایک قصہ بیان کیا ہے ، جسے بعض نے محل نظر جانا ہے ۔ ان کے مطابق ایک موقع پر برہمن نے شاہ جہاں کی فرمائش پر (بعض کے نزدیک دارا شکوہ اس کی غزل لے کر شاہ جہاں کے پاس گیا تھا) شعر سنانے چاہے تو پہلے یہ شعر پڑھا :

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار ‏ ‏ بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

(میرا دل کچھ ایسا کفر آشنا ہے کہ میں اسے کئی مرتبہ کعبہ لے گیا لیکن پھر بھی اسے ویسے کا ویسا برہمن ہی واپس لایا) ۔

بادشاہ کی طبیعت کچھ پہلے ہی آزردہ تھی اب اور منغّص ہوگئی ۔ اس پر افضل خاں نے فوراً سعدی شیرازی کا یہ شعر پڑھ دیا ۔

خرِّ عیسیٰؑ اگر بمکّہ رود ‏ ‏ چوں بیا یدہنوز خر باشد

(اگر حضرت عیسیٰؑ کا گدھا مکّے چلا جائے تو جب وہ واپس آئے گا گدھے کا گدھا ہی ہوگا) ۔

اس سے بادشاہ کی طبیعت بحال ہوگئی ۔[۱۶]

مفتاح التواریخ کے مؤلف کے علاوہ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے درج ذیل شعر اُس سے منسوب کیا ہے جب کہ شفیق اور سرخوش کو اس میں تامل ہے ۔ سرخوش کے مطابق تحقیق سے پتا چلا ہے کہ یہ کسی اور ہندو کا ہے ؛ سرخوش نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ایک روز میرزا محمد علی ماہر نے برہمن سے اس شعر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا مجھے یاد نہیں شاید میں نے کہا ہو :[۱۷]

ببیں کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ ‏ ‏ کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

(اے شیخ ! میرے بت خانے کی کرامت ملاحظہ ہو کہ جب یہ ویران ہو جاتا ہے تو خانۂ خدا بن جاتا ہے) ۔

---

۱۶ کلمات الشعرا مرتبہ دلاوری لاہور ص ۱۸ ، نیز گل رعنا ص : ۱۱

۱۷ گل رعنا فصل دوم : ص ۱۱ ، کلمات الشعرا ، ص : ۱۸

برہمن نے "منشأت" میں اپنی کئی دیگر تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں چہار چمن، گلدستہ، تحفتہ الانوار، نگار نامہ وغیرہ اور دیوانِ فارسی قابلِ ذکر ہیں۔ بالخصوص منشات، چہار چمن اور دیوان کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ حسرت موہانی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں (جو غالباً نگار میں شائع ہوا تھا) اس کے دیوان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی تقریباً ہر غزل میں پانچ سے زیادہ اشعار نہیں ہیں۔ جناب ڈاکٹر سید عبداللہ برہمن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ برصغیر کے بہترین ہندو شعرا میں سے تھا۔ اور یہ کہ:

"برہمن کو عام طور پر دوسرے درجے کا شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے اشعار کی شیرینی اور لطافت عہد شاہ جہانی کے اچھے شعرا کے لگ بھگ ہے۔ سادگی اس قدر ہے کہ اس زمانے میں کسی کے یہاں نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں نے برہمن کو پسند نہیں کیا، لیکن یہی وہ وصف ہے جس کی بنا پر ہم برہمن کو عہد شاہ جہانی کا پسندیدہ شاعر مانتے ہیں۔ صائب نے اس کے اشعار کو اپنی بیاض میں درج کیا ہے اور یہ سب سے بڑا اعتراف ہے جو ایک شاعر کی جانب سے دوسرے شاعر کے حق میں ہو سکتا ہے۔ برہمن کی نمایاں شاعرانہ خصوصیت سادگی کلام ہے۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمن کا کلام اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا تھا۔ عشق کی کیفیات، محبت کی صعوبتیں تصوف کی منزلیں، وحدۃ الوجود کے مسائل برہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں، جس طرح مسلمان شعرا کے کلام میں"[۱۸]

محمد صالح کنبو نے اس کے طرز زندگی پر بات کرتے ہوئے اس کی شاعری پر بھی رائے دی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کی شاعری سادہ بھی ہے اور تکلف سے عاری بھی:

"چون شعر خود در کمال سادگی و بے تکلفی می زید[۱۹]" (اپنی شاعری کی طرح بڑی سادگی اور بے تکلفی سے زندگی بسر کرتا ہے)۔

وحدت الوجود سے متعلق اس کے اشعار ملاحظہ ہوں:

---

۱۸ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۸۱ - ۸۳

۱۹ عمل صالح ۔۔۔ جلد ۳، ص: ۴۲۳ -

بانی خانہ و بتخانہ و میخانہ یکیست   خانہ بسیار ولی صاحب ہر خانہ یکیست
گل یکی خار یکی شاخ یکی تاک یکیست   نزد ارباب نظر ہر خس و خاشاک یکیست

● ـــ مکان، بت خانہ اور میخانے کا بانی ایک ہی ہے۔ مکان تو بہت سے ہیں لیکن صاحب خانہ ایک ہی ہے۔

پھول ایک، کانٹا ایک، شاخ ایک اور تاک (انگور کی بیل) ایک ہی ہے۔ ارباب نظر کے نزدیک ہر خس و خاشاک ایک ہے۔

انتخاب :

۱۔ ما حالِ دلِ خویش نہفتیم و نگفتیم   شب تا سحر از درد نخفتیم و نگفتیم
۲۔ با رشتۂ مژگان ہمہ شب دانہ اشکی   از غیر نہاں داشتہ سفتیم و نگفتیم
۳۔ در راہِ محبت بہ خیالِ قدمِ او   ہر مرحلہ را با مژہ رُفتیم و نگفتیم
۴۔ در سینۂ خود رازِ غمِ عشق برہمن   چوں غنچہ بصد پردہ نہفتیم و نگفتیم

۵۔ کنم ز سادہ دلی بندِ دیدہ مژگان را   بمشتِ خس نتوان بست راہِ طوفان را
۶۔ شبی خیال تو آمد بخواب آسودیم   دگر ز ہم نکشودیم چشمِ گریاں را
۷۔ ہر نفس بوے محبت آید از گفتارِ ما   می توان فہمید از گفتارِ ما مقدارِ ما
۸۔ ز روی عجز بنہ بر زمیں جبین نیاز   کہ ما شکستہ دلانیم و او شکستہ نواز
۹۔ چو روزِ حشر برہمن حساب پیش آرند   ز آبِ دیدہ بشوئیم نامۂ اعمال

رباعی :

تا چند ز جور فلک آزردہ شوی   وز گردش روزگار افسردہ شوی
چوں غنچہ بہ جمعیّت خود راضی باش   زاں پیش کہ چوں گل شوی پژمردہ شوی

ترجمہ :

۱۔ ہم نے اپنا حال دل چھپائے رکھا اور کسی سے نہ کہا۔ شب تا سحر درد کے باعث نہ سوئے لیکن کسی پر ظاہر نہ کیا۔

۲ - ہم پلکوں کے دھاگے میں، غیر سے چھپا کر تمام رات اشکوں کے موتی پروتے رہے لیکن ہم نے کسی کو نہ بتایا ۔

۳ - راہِ محبت میں ہم نے اس کے قدموں کے خیال میں ہر مرحلے پر پلکوں سے جھاڑو دیا اور کسی سے نہ کہا ۔

۴ - برہمن ! ہم نے اپنے سینے میں غم عشق کا راز غنچے کی مانند سینکڑوں پردوں میں چھپائے رکھا لیکن کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا ۔

۵ - میری سادہ دلی ملاحظہ ہو کہ میں پلکوں سے آنکھوں کے آگے بند باندھتا ہوں۔ حالانکہ چند تنکوں سے سیلاب کا راستہ بند نہیں کیا جا سکتا ۔

۶ - ایک رات خواب میں تیرا خیال آیا تھا جس سے ہمیں سکون مل گیا۔ پھر ہم نے اپنی روتی ہوئی آنکھوں کو نہیں کھولا ۔

۷ - ہر پل ہماری گفتار سے محبت کی خوشبو آتی ہے ۔ ہماری گفتار ہی سے ہماری مقدار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۸ - عاجزی کے ساتھ جبینِ نیاز زمین پر رکھ ، کیونکہ ہم شکستہ دل ہیں اور وہ شکستہ نواز ہے ۔

رباعی :

کب تک تو جورِ فلک سے آزردہ رہے گا اور گردش زمانے کے باعث افسردگی کو خود پر طاری رکھے گا ۔

غنچے کی طرح اپنی جمعیت پر راضی رہ ، اس سے پہلے کہ تو پھول بن کر مرجھا جائے ۔

اس مضمون کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ۔

۱ - منتخب التواریخ از ملّا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی ۔ نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۴ھ

۲ - " " " اردو ترجمہ از محمود احمد فاروقی ۔ لاہور ۱۹۶۲ء

٣ ۔ عمل صالح الموسوم بہ شاہجہان نامہ (جلد ٣) از محمد صالح کنبو،
مجلس ترقی ادب ۔ لاہور ١٩٦٠

٤ ۔ تذکرۂ گل رعنا (فصل دوم) مرتبہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی مطبوعہ دکن ؟

٥ ۔ کلمات الشعرا از محمد افضل سرخوش مرتبہ صادق علی دلاوری، لاہور ؟

٦ ۔ مفتاح التواریخ از طامس ولیم بیل ۔ نولکشور ۔ لکھنؤ ١٢٨٤ھ

٧ ۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ۔ انجمن ترقی اردو (ہند)
دہلی ١٩٤٢ء